بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف

خالق کا اپنے بندوں سے آخری خطاب ہے جو اُس نے اپنے ایک برگزیدہ بندے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے فرمایا۔ بظاہر یہ ایک کتاب ہے حقیقت میں یہ اللہ تعالےٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جسے کسی ایک نام سے پکارا جا نہیں سکتا۔ اس کے اوصاف شمار میں نہیں آسکتے۔ عوام کے لیے یہ کتاب وعظ و نصیحت ہے اہل علم کے لیے خزینۂ علوم ہے اہلِ دانش کے لیے کتاب حکمت ہے اہل دل کے لیے گنجینۂ اسرار ہے حقائق سے رُوگردانی کرنے والوں کے لیے براہین قاطعہ اور دلائل باہرہ کا خزانہ ہے اور متلاشیانِ حق کے لیے کتابِ ہدایت ہے۔

اس کے اوصاف کی نشاندہی فرماتے ہوئے خود خالق نے عجیب اسلوب اختیار فرمائے۔ سب سے پہلا تعارف اس صفت سے کرایا کہ لا ریب فیہ یعنی یہ کتاب شکوک و شبہات سے بالاتر ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ کا اپنا کلام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ہر آمیزش اور کمی بیشی کے نقص سے محفوظ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جس مقصد کے لیے یہ نازل کیا گیا اُسے پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پوری انسانیت کے لیے راہنمائی کی ضمانت ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا یہ وصف ایسی بنیاد ہے کہ اس پر یقین کے بغیر اس سے استفادہ کرنا ممکن ہی نہیں اور یہ کوئی زا دعوےٰ نہیں بلکہ اس کے نزول سے لے کر آج تک اس اَمر کی شہادتیں تاریخ انسانی میں بکھری پڑی ہیں کہ جس فرد نے یا جس جماعت نے اس وصف کو تسلیم نہ کیا وہ رہنمائی سے محرُوم رہی اور ضلال مبین اور ضلال بعید اس کے لیے مقدر ہو گئی۔

اس کے متصل ہی دوسرا وصف "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" بیان ہُوا یعنی یہ کتاب ہر اس شخص کو ہدایت کا رستہ دکھا کر منزل تک پہنچاتی ہے۔ جو ہدایت کا طالب ہو اور بھلے مانسوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہو۔ اس کتاب کا یہ وصف دراصل اس کا مقصدِ نزول ہے جبکہ اس کے باقی تمام اوصاف ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان مذکورہ ذرائع سے اس مقصد تک پہنچنا مطلوب ہے۔ ان اوصاف کا بیان مختلف انداز سے جا بجا ملتا ہے مثلاً :

۱۔ هٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۔

۲۔ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ ۔

۳۔ كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۔

۴۔ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۔

۵۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۔

۶۔ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۔

۷۔ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۔

اس کتاب کے اس قسم کے اوصاف کے علاوہ جہاں اس کے مقصدی وصف کا تذکرہ ہوا وہاں اسے بالعموم لام تعلیل کے ساتھ ذکر کیا گیا، مثلاً :

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ اور

لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا ۔

اہلِ علم اور اہلِ دل نے اس کتاب کے اِن ہی مختلف اوصاف کی تشریح اور تفصیل میں تفسیریں لکھیں۔ اہلِ علم کے نزدیک فنِ تفسیر کے چند خاص تقاضے ہیں چند مخصوص شرائط ہیں مثلاً تفسیر لکھنے میں حل لغات، تعلیل صرفی، ترکیب نحوی، علم بدیع اور علم معانی کی روشنی میں نکات، شانِ نزول کا بیان، ناسخ و منسوخ کی وضاحت، اجمال اور تفصیل، مطلق اور مقید کی نشاندہی، آیات سے فقہی مسائل کا استنباط، علم کلام کی بحثیں وغیرہ ۔ بے شمار ایسے مسائل ہیں جن پر مفسرِ قرآن کو قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ جہاں تک علمی تحقیق کا تقاضا ہے ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے مقصدی وصف کا تعلق ہے اس کے لئے علمی نکارت اور فنی باریکیوں کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی حقیقت کیطرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا : ولقد یسّرنا القرآن للذکر ۔ کہ جسے قرآن سے ہدایت حاصل کرنی ہے۔ جان لے کہ ہم نے اس غرض کے لئے قرآن کو آسان بنایا ہے اس اظہارِ حقیقت کے ساتھ ہی یہ صلائے عام بھی دے دی فھل من مدکر۔ یعنی ہے کوئی ہدایت کا طالب ؟

حصولِ ہدایت کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل ہدایت بذریعہ ذہن، عقل اور استدلال؛ یعنی حقیقت کو اس لئے تسلیم کرنا کہ میرا ذہن، میری عقل اسے تسلیم کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور ذہن و عقل نے جو استدلال کا تانا بانا تیار کیا ہے وہ اسی امر کا تقاضا کرتا ہے اس ذریعہ سے ہدایت حاصل کرنے

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ بڑا کمزور اور ناقابلِ اعتماد ذریعہ ہے کمزور اس لیئے کہ جس درجہ کا ذہن اور جس سطح کی عقل ہوگی اُسی درجے کا ایمان بھی ہوگا اور ناقابلِ اعتماد اِس لیئے کہ اگر اس سے بہتر استدلال پیش کردیا گیا اور وہ پہلے استدلال کے برعکس ہوا تو ایمان زائل ہوگیا عقیدہ بدلنا پڑا

دُوسری صورت ہدایت بذریعہ قلب ہے اس صُورت میں پہلی اور بنیادی چیز دعوت دینے والے پر اعتماد ہے اور جاننے سے پہلے "ماننے" کا مطالبہ ہوتا ہے اور یہ اعتماد یا تو عام تجربہ اور مشاہدہ پر قائم ہوتا ہے یا اُس وجدانی کیفیت پر مرتب ہوتا ہے جسے محبت کہتے ہیں ہدایت کی یہ صُورت فطری اور طبعی معلوم ہوتی ہے چنانچہ خود قرآن کے نزول کے متعلق ارشادِ باری ہے :

" وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ "

نزولِ قرآن کا محل اور مقام قلبِ محمد ﷺ ہے جس سے ظاہر ہے کہ حصُولِ ہدایت کا آلہ اور ذریعہ قلبِ انسانی ہے اور ہدایت سے محرُومی کی وجہ بھی شقاوتِ قلبی ہوتی ہے غالباً اسی خطرہ سے آگاہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

" وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا "

یعنی جس کے قلب کا تعلق اپنے ربّ سے کٹ گیا ہے یا جو قلب اس عظمت سے غفلت کا شکار ہے اس کی بات پر توجہ نہ دیں ورنہ اس کی نحوست سے بچنا محال ہے بات گو زبان سے کی جاتی ہے مگر وہ قلب سے ناشی ہوتی ہے اس لیے غافل قلب سے غفلت کی نحوست لے کر زبان سے نکلتی ہے اور سُننے والے کے کانوں کے راستے اس کے دل تک پہنچ کر اُسے بھی غافل کردیتی ہے

رہی اعتماد کی بات تو نبی کریم ﷺ نے اپنی معاشرتی زندگی کو اس امر کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ کہ تمھارے معاشرے میں عُمر کا معتدبہ حصہ یعنی چالیس برس گزار چکا ہوں کیا تم مجھے قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے ؟

کامل اور غیر مشروط اعتماد صرف محبت کے جذبے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے غالباً اسی وجہ سے حضور پُرنور ﷺ نے فرمایا تھا "تم میں سے کوئی شخص کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کے دل میں سب محبوب چیزوں سے بڑھ کر میرے ساتھ محبت کا جذبہ موجود نہ ہو" اور اللہ تعالےٰ نے مومن کا وصف بیان فرمایا، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔

اس قلبی ذریعہ سے ہدایت حاصل کرنے اور ایمان کی قوت کے نمونے عہدِ نبوت میں کثرت سے ملتے ہیں چنانچہ واقعہ معراج کے وقت رؤسائے قریش نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ازراہِ طنز جب یہ واقعہ سنایا اُنھوں نے معراج کے متعلق کوئی عقلی دلیل نہیں دی بلکہ صرف اتنا پوچھا کہ کیا واقعی حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے ؟ جب انھیں بتایا گیا کہ واقعی حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ پھر اس میں کوئی شک نہیں۔ ذہن، عقل اور استدلال کی راہ سے یہ دولت ملی ہوتی تو یہاں بھی استدلال کا سہارا لیا جاتا۔

قرآنِ حکیم گلہائے رنگا رنگ کا ایسا حسین گلدستہ ہے جس کی ہر آیتِ کریمہ اپنی بوقلمونی میں یکتا و بے مثل ہے جس پہلو سے دیکھیں حسین امتزاج کا نظارہ اور کیف و وجد کا اثر جدا ملتا ہے۔ مفسّرین کرام نے اپنی عمریں اس گلدستہ کی بہار آفرینی میں صرف کر دیں۔ فنِ تفسیر کی حدود و قیود کے تابع رہ کر اور ایک ہی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے ہر تفسیر کا اسلوب منفرد معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ جس پہلو سے کسی نے اس مرقعِ حُسن کو دیکھا اُسی جہت سے تصویر کشی کی۔ کیونکہ قرآن کی ایک ہی تفسیر کامل و اکمل ہے اور وہ ہے صاحبِ قرآن ﷺ کی سیرتِ طیّبہ۔ باقی ہر تفسیر کسی ایک رنگ کی حامل ہوگی جو قرآن حکیم ہی کا رنگ ہوگا۔ لیکن اس پہ منحصر کہ دیکھنے والے نے کس پہلو سے دیکھا۔

یہ تفسیر بھی، جو آپ کے ہاتھ میں ہے اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتی ہے جس میں منظر کشی تو کم ہے لیکن کیف و وجد کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جسے قاری براہِ راست اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک الگ فن ہے۔ اور مفسّر اس فن کے ملکی و عالمی سطح پر مانے ہوئے ماہر ہیں یہ اعجاز انھیں ایک صاحبِ حال و قال ہستی حضرت العلام شیخِ طریقت مولانا اللہ یار خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی خدمت میں طویل عمر بسر کرنے کے صلہ میں نصیب ہوا۔

یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے اہل اللہ کی ایک جماعت جس میں حضرت مولانا بھی شامل تھے۔ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں ملتزم پہ حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ عطاء و کرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ اس کتاب کے مصنف کو وہ نعمت خصوصی عطا ہوئی جو صرف ان ہی کا حصہ تھی۔ یعنی فہمِ قرآن۔ اس کے بعد سُننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت مولانا کی زبان سے قرآن حکیم کی تفسیر کرتے ہوئے وہ مضامین جاری ہونے لگے کہ اہلِ علم اور ان لوگوں کی زبان سے بے ساختہ نکلا جن کی عمریں درسِ قرآن میں گزری تھیں،

"اِس آیت کا اصل مفہوم تو آج سمجھ میں آیا"۔

ایک صاحبِ دل رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل صحبت نے حضرت مولانا کے قلب کو رموز و اسرارِ قرآن سے وہ نسبت عطاء کر دی جو براہِ راست خفتہ دلوں کو بیدار کرنے اور غافل دلوں کو ہوشیار کرنے اور یادِ الٰہی سے آشنا دلوں میں محبتِ الٰہی کو مستحکم اور استوار کرنے میں ممد و معاون ہے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کا پیغام اور قرآن کا مفہوم ان کے قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہُوا جس کو اصطلاح میں علمِ لدُنّی کہتے ہیں اور انھوں نے اس پیغام کو اہلِ دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے،

از دل خیزد، بر دل ریزد

کیفیات کو محسوس کرنے کا کام ہی دِل کا ہے۔ اور دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ قرآن فہمی سے مراد حصولِ معلومات نہیں بلکہ حصولِ کیفیات ہے۔ قرآن اس طرح پڑھا اور سمجھا جائے کہ دِلوں کو تحریک ملے۔ یہ مقصد اس تفسیر کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

عبدالرزاق عفی عنہ

۱۸، رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ